افتاء اور استفتاء، سیرۃ طیبہ کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی *

الحمد لله رب العٰلمين والعاقبة للمتقين والصلوٰة والسلام علىٰ خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين امابعد فاعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم

ليستفتو نك فى النسآء قل الله يفتيكم فيهن و ما يتلىٰ عليكم فى الكتاب فى يتامى النسآء التٰى لا تو تو هن ما كتب لهن و تر غبون ان تنكحوهن والمستضعفين من الولدان و ان تقو مواللیتامیٰ بالقسط و ما تفعلوٰ من خير فان الله كان به عليماً . صدق الله العظيم.

نبی کریم رؤف رحیم علیہ الف الف تحیۃ وتسلیم کی سیرۃ طیبہ اور آپ کی حیٰوۃ مطہرہ کی روشنی میں افتاء اور استفتاء کے مطالعہ کے لیے سورۃ النساء کی یہ آیت اساسی مصور کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس سے اس عہد کے دیرینہ، اہم معاشرتی مسائل کی طرف بھی رہنمائی ہوتی ہے، ان کے بارے میں استفتاء وسوال کے آداب کا بھی علم ہوتا ہے، نبی کریمؐ کی جانب سے جواب وفتویٰ کا اسلوب بھی آشکار ہوتا ہے۔ اور اس عہد کے فتاویٰ کے ماٰخذ ومصادر کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم سیرۃ طیبہ کی روشنی میں افتاء واستفتاء کا جائزہ لیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افتاء اور استفتاء کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ پر غور کرلیا جائے۔

لغوی معنیٰ:

امام راغب اصفہانی نے فتویٰ کے مختلف استعمالات کی روشنی میں اس کے مختلف معانی بیان کیئے ہیں۔ راغب لکھتے ہیں ''کسی مشکل مسئلہ کے جواب کو فتویٰ کہا جاتا ہے''۔(۱) **فاستفتهم** کے معنیٰ ان سے پوچھو اور **افتون فى امرى** کے معنیٰ میرے معاملہ مجھے مشورہ دو'' (۲)

---

* اسسٹنٹ پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب، لاہور

راغب نے آیت مذکورہ

ان دونوں الفاظ کی بھی وضاحت کی ہے کہ استفتاء کے معنیٰ فتویٰ طلب کرنا اور افتاء کے معنیٰ فتویٰ دینا ہے(۳)

علامہ ابن منظور افتاء اور فتویٰ کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''و الفتیا تبین المشکل من الاحکام اصلہ من الفتی وھو الشاب الحدث الذی شب و قوی، فکانۃ یقوی ما اشکل بیانہ فیشب ویصیر فتیا قویا''(۴)

فتوی کے معنی ہیں مشکل احکام کو واضح کرنا، اس کی اصل فتیٰ ہے یعنی اب نوجوان جو طاقتور ہو گویا مفتی اپنے فتویٰ اپنے بیان کے ذریعہ سے مضبوط اور قوی بناتا ہے۔

اصطلاحی معنیٰ:

وھبہ الزحیلی فتویٰ کے اصطلاحی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''و ھی مسائل استنبطھا المجتھدون المتاخرون لما سئلوا عنھا ولم یجدو افیھا روایۃعن اھل المذھب المتقدمین ''(۵)

(فتویٰ ان مسائل کا نام ہے۔ بعد کے مجتہدین نے جبکہ ان سے پوچھا گیا انہیں مستنبط کیا جبکہ اس سلسلہ میں ان کے مذہب کے مقدمین کی کوئی روایت موجود نہ تھی)۔

گویا وھبہ زحیلی کے نزدیک فتویٰ دینے کے لیے مفتی کا مجتہد ہونا ضروری ہے اور ان کے نزدیک فتویٰ صرف اس صورت میں فتویٰ کہلائے گا جب کہ اس خاص مسئول مسئلہ میں متقدمین کی کوئی رائے موجود نہ ہو، یعنی ان کی رائے میں نقل فتویٰ کا نام فتویٰ دینا نہیں۔ نواب صدیق حسن خان ابجد العلوم میں فتویٰ کے اصطلاحی مفہوم پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ھو علم تروی فیہ الاحکام الصادرۃ عن الفقھاء فی الواقعات الجزئیۃ یسھل الامر علی القاصرین من بعد ھم(٦)

(علم فتویٰ وہ علم ہے جس میں ان احکام کو نقل کیا جاتا ہے جو فقہاء سے واقعات جزئیہ کے بارے میں صادر ہوتے ہیں تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے معاملات آسان ہو جائیں)

فتویٰ کی مذکورہ دو تعریفات سے فتویٰ کی حسب ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

فتویٰ مسائل کے اس مجموعہ کا نام ہے جن کو کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے بعد کے فقہاء نے مستنبط کیا ہے۔

۲ فتویٰ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کے ممتاز فقہاء جن میں مسالک اربعہ کے بانیین فقہاء یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل (رحمهم الله) شامل ہیں کا انداز و اسلوب یہ تھا کہ وہ ازخود مسائل فرض کر کے انہیں قرآن وسنت یا اجماع و قیاس سے مستنبط کرتے تھے۔ جبکہ مفتی فتویٰ دینے کے لیے کسی سائل اور اس کے سوال کا محتاج ہوتا ہے اور اس صورت میں کوئی مسئلہ مستنبط یا بیان کرتا ہے۔ جبکہ اس سے کسی مسئلہ کے بارہ میں دریافت کیا جائے۔

۳ وھبہ الزحیلی اور نواب صدیق حسن کی تعریفات سے تیسری خصوصیت مختلف ہو جاتی ہے نواب صدیق حسن خان کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ متقدمین کی آراء کو نقل کرنے کا نام فتویٰ ہے جبکہ وھبہ الزحیلی یہ صراحت کرتے ہیں کہ اس مسئلہ پر متقدمین فقہاء میں سے کسی کی رائے موجود نہ ہو۔

۴ نواب صدیق حسن خان کی تعریف سے یہ خصوصیت بھی سامنے آتی ہے کہ فتویٰ اصول و کلیات اور بنیادی قواعد و ضوابط میں بحث و تحقیق کا نام نہیں بلکہ پیش آمدہ جزوی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کا نام ہے۔

۵ وھبہ زحیلی کی تعریف میں استنطهاء المجتهد و ن کے الفاظ اس بات کو واضح کررہے ہیں کہ مفتی پیش آمدہ مسئلہ کے سلسلہ میں قرآن وسنت سے استنباط کرے گا۔

قرآن کریم میں استعمال:

قرآن کریم میں استفتاء و افتاء کے ذکر کے دو اسالیب ہیں۔

۱۔ کچھ آیات مبارکہ میں "یسئلونك کا عنوان اختیار کیا گیا قرآن کریم میں ایسی کل ۱۱۳ آیات ہے جن میں "یسئلونك کا لفظ آیا۔

۲۔ بعض دیگر آیات میں جن کی تعداد ۳۰ ہے، یسئلونک کے بجائے لیستفتونک کا عنوان اختیار کیا گیا ہے۔ان دونوں اسالیب میں جو باتیں پوچھی گئی ہیں بنیادی طور پر ان کا تعلق حسب ذیل تین شعبوں سے ہے۔

i تاریخی واقعات وحقائق

ii ایمانی اور روحانی حقیقتیں

iii عملی زندگی کے احکام

تاریخی واقعات وحقائق میں ''ذوالقرنین'' کے بارے میں سوال کا ذکر ہے، یہ سوال اہل مکہ کی جانب سے یہود کی تحریک پر ہوا تھا، اس کا ذکر سورۃ کہف میں ہے جو مکی سورۃ مبارکہ ہے (۷) روحانی اور ایمانی حقیقتوں کے بارے میں ایک سوال ''روح'' کے متعلق کیا گیا یہ بھی اسی سلسلہ کا سوال تھا جس سلسلہ کا ذوالقرنین سے متعلق تھا یہ سوال سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اور یہ سورۃ بھی مکی ہے۔(۸) علاوہ ازیں پہاڑوں کے بارے میں سوال سورۃ طہٰ میں نقل کیا گیا یہ بھی مکی سورۃ مبارکہ ہے، اس سوال کا تعلق بھی ایمانیات سے ہے(۹) مذکورہ تین مواقع کے علاوہ ''یسئلونک کا لفظ احکام سے متعلق سوالات کے لیے بولا گیا ہے۔

اس ضمن میں یہ لفظ سورۃ بقرۃ میں سب سے زیادہ یعنی ۶ مرتبہ استعمال ہوا ہے ایک مرتبہ سورۃ مائدہ میں اور ایک مرتبہ سورۃ احزاب میں استعمال ہوا ہے۔یستفتونک کا لفظ تین مرتبہ استعمال ہوا ہے جن میں سے دو مرتبہ سورۃ النساء میں استعمال ہوا اور ایک استفتاء میں متعدد فتاویٰ دیئے گئے جن کا تعلق معاشرہ کی عملی زندگی، عدل وانصاف، طہارت وپاکیزگی اور مالی معاملات سے ہے۔

اب ہم تفصیل سے ان موضوعات کا جائزہ لیں گے جن کے بارے میں قرآن میں سوال، استفتاء اور فتویٰ کا ذکر ہے اور اسی تفصیل سے نبی کریمؐ کی سیرۃ مطہر کی روشنی افتاء واستفتاء کا اسلوب واضح ہو کر سامنے آئے گا۔

حرام وحلال کے بارے میں سوال:

سورۃ المائدۃ میں صحابہ کے اس سوال کا تذکرہ کیا گیا کہ یہ صحابہ آپ سے یہ دریافت کریں گے۔

''ماذا احل هم''(١٠)(ان کے لئے کیا کچھ حلال ہے) یہ سوال سورہ المائدۃ میں نقل کیا گیا جو کہ مدنی سورتوں میں سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام سے سول و استفتاء کا طریقہ سابق امتوں میں بھی موجود تھا لیکن امم سابقہ کے افراد نے اپنے انبیاء سے اصولی اور بنیادی نوعیت کے سوالات کرنے کے بجائے جزوی اور فروعی قسم کے سوالات کیئے جن سے ان کی مشکلات میں اضافہ ہوا مثلاً یہ کہ جس گائے کے ذبح کا حکم دیا گیا ہے، وہ کیسی ہو، اس کا رنگ کیسا ہو، اور اس کی حقیقت و نوعیت کیا ہو، اس قسم کے سوالات سے ان کی دقتوں اور مشکلات میں اضافہ ہوا جبکہ صحابہ کرام نے اصولی اور بنیادی نوعیت کے سوالات کیئے اور فروعی مسائل اجتہاد امت کے حوالے کر دیئے۔ انہی اصولی سوالات میں ایک سوال یہ کیا گیا کہ کھانے پینے میں ان کے لیے کیا چیزیں حلال ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے اس سوال سے عہد نبوی کے استفتاء و سوال کے آداب بھی سامنے آ رہے ہیں اور یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ صحابہ کرام شرعی احکام کے لیے کس قدر بے چین و بے قرار ہیں وہ اس بات کے منتظر نہیں کہ کب از خود احکام شرعیہ نازل ہوں اور ان کو بتا دیے جائیں بلکہ وہ خود آگے بڑھ کہ سوال کر رہے ہیں۔

یہاں ضمناً ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ نے یہ کیوں دریافت کیا کہ ہمارے لیے کیا حلال ہے سوال کی نوعیت یہ کیوں نہیں کہ ہمارے لئے کیا ممنوع اور حرام ہے عقلی اعتبار سے مباح و حلال سے زیادہ ممنوع و حرام کے معلوم ہونے کی فکر ہونی چاہیے۔

سوال کی اس نوعیت کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔

۱۔ سورۃ المائدہ کے آغاز میں **بھیمۃ الانعام** کو حلال قرار دیا گیا اور پھر مردار، بہتا ہوا خون، سور کا گوشت، جو جانور اللہ کے سوا کسی کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور تمام غیر مذبوح جانور حرام قرار دیئے گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام گوشت خور جانور حرام قرار دیئے جن سے یہ سوال پیدا ہوا کہ ان گوشت خور جانوروں کا کیا ہوا شکار بھی حرام ہے یا حلال اور یہ سوال اس آیت مبارکہ میں نقل کیا گیا، اس پس منظر کی وجہ سے سوال میں تعبیر حرام کے بجائے حلال کی استعمال کی گئی۔

۲۔ حلال اموز کو سرانجام دینا مثبت سرگرمی ہے جبکہ حرام سے بچنا منفی عمل ہے۔ صحابہ کرام اپنے اس سوال سے یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں کہ دین کے بارے میں ان کا رویہ مثبت ہے نہ کہ منفی۔ وہ دین کو صرف ممنوعات اور پابندیوں کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ ایک متعدل نظام زندگی سمجھتے ہیں جس میں کچھ پابندیوں کے ساتھ ساتھ کچھ چیزوں میں آزادی اور اجازت بھی دی گئی، اسی رویہ کے اظہار کے لیے صحابہ نے یہ دریافت کرنے کے بجائے کہ ان پر کیا کچھ حرام اور ممنوع ہے یہ سوال کیا کہ ان کے لیے کیا کچھ جائز اور مباح ہے۔ حرام وحلال کے اسی سلسلہ سوال میں سورۃ البقرۃ میں شراب اور جوئے سے متعلق سوال نقل کیا گیا اور اس سوال کے جواب میں خمر و میسر کے بارے میں ابتدائی حکم دیا گیا (۱۱)

مالی معاملات سے متعلق سوال:

عہد نبوی کے استفتات و سوالات کا دوسرا اہم موضوع مالی معاملات سے متعلق سوالات ہیں۔ ایک ہی سوال سورۃ البقرۃ میں دو مرتبہ نقل کیا گیا اور دونوں مرتبہ اس کا مختلف جواب دیا گیا (۱۲) سوال کے جوابات کیا دیئے گئے، ان تفصیلات کی تو اس وقت گنجائش نہیں البتہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب میں کیا حکمت ہے اس سوال کا جواب ہمارے آج کے موضوع سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں اس کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلی مرتبہ یہ سوال عمرو بن الجموح نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تھا اور اس کے سوال کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں۔ چنانچہ اس آیت مبارکہ میں اسی کو مدنظر رکھ کر جواب دیا گیا۔ جبکہ دوسری مرتبہ کا سوال ابن ابی حاتم کی روایت کے مطابق انفاق فی سبیل اللہ کے حکم پر ہوا کہ کچھ صحابہ نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ انفاق فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے، ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں کہ کونسا مال اور کیا چیز اللہ کی راہ میں خرچ کی جائے۔ (۱۳)

امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے دو مختلف ابوب میں دو مختلف روایات نقل کی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب قریب ایک جیسے سوال کیے گئے اور آپ نے اس کے مختلف جوابات مرحمت فرمائے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فضل الباری شرح صحیح بخاری میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے مختلف محدثین وشارحین کے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد خلاصہ کلام کے طور پر جوبات کی ہے، اس سے اس کی وجہ واضح ہو جاتی ہے۔ مولیناً لکھتے ہیں۔

''الغرض ان احادیث میں مسائل ومخاطب بھی مختلف ، اوقات بھی مختلف شئون حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی متفرق، وجوہ فضیلت بھی مختلف اور اکثر روایات سوال کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں، اب اگر جوابات مختلف ہوئے تو شبہ کی کیا وجہ'' (۱۴)

تعین اوقات عبادت:

اوقات وایام عبادت کی تعین کے لئے چاند کے بارے میں سوال کیا جائے گا اس کا ذکر بھی سورۃ البقرۃ میں کیا گیا۔ اس سوال میں بھی چاند کے بارے میں اصولی نوعیت کا سوال کیا گیا (۱۵)

معاشرتی امور کے بارے میں سوال واستفتاء:

حلال وحرام، انفاق فی سبیل اللہ اور عبادت واوقات کی تعین کے علاوہ عہد نبوی میں سوال و استفتاء کا بڑا موضوع معاشرہ کے مسائل تھے۔ ان معاشرتی مسائل میں دوقسم کے مسائل بہت اہم، نازک اور پیچیدہ نوعیت کے تھے، جن کے بارے سوال واستفتاء کیا گیا۔

الف: یتیم کی پرورش کے بارے میں سوال کیا گیا

ب: عورتوں کے بارے میں خصوصی مسائل دریافت کیے گئے۔ عورتوں کے جن مسائل کے بارے میں استفتاء کئے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱ دوران ایام ناپسندیدگی کے احکام (۱۶)

۲ عورتوں کے بارے میں تفصیلی احکام کا حوالہ سورۃ النساء کی اس آیت مبارکہ میں دیا گیا جسے آغاز میں تحریر کیا گیا تھا (۱۷)

سورۃ النساء کی چار آیات میں تفصیل سے افتاء نقل کیا گیا جس میں عورتوں کے مہر اور ان کی میراث سے متعلق احکام ازدواجی زندگی سے متعلق خوبصورت ہدایات دی گئیں (۱۸)

نظریاتی وفکری امور کے بارے میں سوال:

عرب کی معاشرت وتمدن پر غور کیا جائے ،تو محسوس ہوگا کہ عرب عموماً اور اہل حجاز خصوصاً اپنی ذہنی ،فکری اور تمدنی زندگی میں سادگی اور بدویت پر عمل پیرا تھے۔ اس لیے نظریاتی اور فکری معاملات کے بارے میں زیادہ سوال نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے بارے میں سوال قرآن کریم میں دو مقامات پر ان الفاظ میں مذکور ہے۔

یسئلو نک عن الساعة۔(۱۹)

سورۃ الاعراف میں اس کا جواب دیا گیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے کہ قیامت کب برپا ہوگی اور سورۃ النازعات میں یہ کہا گیا کہ نبی کو یہ خبر دینے کی ضرورت ہے اور نہ ہی امت کو یہ معلوم کرنے کی حاجت کہ قیامت کب برپا ہوگی۔ اسے قیامت پر غیر متزلزل ایمان لانا چاہیے اور قیامت کے دن کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس دن انسان دو حصوں میں تقسیم ہونگے ایک وہ جن کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں پکڑایا گیا اور وہ پروردگار عالم کی طرف نجات دے دیئے گیئے اور دوسرے وہ جن کو نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں پشت کی جانب سے دیا گیا اور وہ سزا کے مستحق ٹھہرے۔

قرآن کریم نے ان سوالات کا ذکر کیا، ان میں سے عملی زندگی سے متعلق سوالات صحابہ کی جانب سے ہوئے اور نظریاتی اور فکری دنیا سے متعلق قریش مکہ کی جانب سے ہوئے جن میں طلب علم سے زیادہ اس فکر ونظریہ اور دین متین کو تمسخر کا نشانہ بنانے کا مقصد پیش نظر تھا۔ جبکہ صحابہ آپ سے سوالات کم کرتے تھے کہ نبی کا فرمان قانون کی حیثیت رکھتا ہے اگر جواب میں کوئی بات نبی کی زبان سے نکل گئی تو وہ ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے، جس کی پیروی لازمی اور ضروری ہوگی اور یہ حکم الٰہی بھی موجود تھا۔ یاایھا الذین آمنو الاتسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤ کم(۲۰)

مزید یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب واحترام بھی ملحوظ تھا اور یہ آیت مبارکہ بھی پیش نظر تھی۔

یا ایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی (۲۱)

اے ایمان والو! نبی کی آواز سے اپنی آوازوں کو بلند نہ کرنا۔ چنانچہ علم کی پیاس کثرت

سوال کی جانب کھینچ رہی ہے تو اللہ کا حکم اور نبی کریم کا ادب واحترام سوالات کو ایک حد میں لا رہا ہے، اس امتزاجی کیفیت سے سوال واستفتاء کے کچھ آداب سامنے آئے۔

ا۔کلی اور اصولی نوعیت کے سوالات:

صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سوالات دریافت کیئے یا جو استفتاء کیئے، ان مختلف سوالات میں یہ قدر مشترک نظر آئے گی کہ سوالات کلی اور اصولی نوعیت کے ہوتے تھے۔ جزوی اور فروعی نوعیت کے سوالات سے صحابہ گریز کرتے تھے۔

۲۔صرف پیش آمدہ مسائل سے متعلق سوالات:

استفتاءوسوال میں یہ بات بھی ملحوظ ہوتی تھی کہ معاشرہ میں جو سوالات موجود تھے،جن کے جوابات کی ہمہ وقت ضرورت تھی،وہی سوال کیئے گئے۔مفروضات سے متعلق سوال نہیں کئے گئے۔

۳۔سوال کے الفاظ مختصر وجامع:

سوال واستفتاء کے الفاظ پر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ سوال بہت مختصر اور جامع الفاظ میں کیا جاتا تھا۔و یسئلونک ماذاینفقون. و یسئلونک عن الیتامیٰ.ویستفتونک فی النساء اور و لیستفتونک فی الکلالہ اس بات کے گواہ ہیں کہ صحابہ کرام سوال واستفتاء میں اختصار و جامعیت کو حد درجہ ملحوظ رکھتے

۴۔سوالات انتظار وحی کے بعد:

صحابہ کے سوال واستفتاء میں یہ ادب بھی پیش نظر تھا کہ وہ کسی بھی معاملہ میں پہلے وحی کا انتظار کرتے اول تو عموماً وحی اس مسئلہ کو بغیر کسی استفتاء کے حل کر دیتی اگر باوجود انتظار کے وحی نازل نہ ہوتی تو پھر بارگاہ نبوی سے سوال ہوتا۔قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام نے نبی کریمؐ سے صرف سترہ سوال کئے ۔ چند سوالات کا علم حدیث سے حجۃ الوداع پر موقع پر ہوتا ہے۔(۲۲) ان سوالات کو بھی شمار کرلیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ساری نبوی زندگی میں صحابہ کی طرف سے پچاس سے بھی کم سوالات کئے گئے۔

۵۔عقائد ونظریات سے متعلق سوالات سے گریز:

صحابہ کرام کے سوالات پر غور کریں تو محسوس ہوگا نبی مکرم نے ان کی اس طرح تربیت کی تھی عبادات و معاشرت اور اخلاق و معاملات پر تو سوالات کیئے گئے لیکن نظریاتی ،فکری اور ایمانی بنیادوں سے متعلق سوال و استفتاء نہیں کیئے گئے بلکہ فکری اور نظریاتی معاملات قرآن کریم اور نبی کریمؐ کی جانب سے واردہ تشریحات کو کافی سمجھا گیا۔ قیامت سے متعلق جن سوالوں کا ذکر ہوا، وہ قریش مکہ کی جانب سے تھے، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔

۶۔صحابہ کے سوال شوق عمل کے آئینہ دار:

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے اپنے انبیاء علیھم السلام سے سوال نقل کیئے لیکن ان سوالات سے انداز ہوتا ہے کہ یہ لوگ عمل سے فرار کی راہ تلاش کرر ہے تھے اور اس کے لیے انہوں نے بے جا سوالات کا سہارا لیا تا کہ وضاحت ہوتے ہوتے کچھ وقت مزید گزر جائے اور عمل سے بچنے کا حیلہ بھی موجود ہو، اس برعکس صحابہ کے سوالات ان کے شوق عمل کے آئینہ دار تھے۔

۷۔صحابہ کے سوالات حجیت سنت کے آئینہ دار:

بنی اسرائیل اور صحابہ کے سوالات میں بڑا نمایاں فرق یہ نظر آتا ہے کہ صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے فرامین کو حجت اور قانون سمجھتے تھے، اسی وجہ سے براہ راست آپ سے سوال کرتے بنی اسرائیل کی طرح یہ تعبیر اختیار نہیں کی۔

ادع لنار بك يبين لنا۔(۲۲)

اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے واضح کرے بلکہ براہ راست آپ سے پوچھا گیا اور اسی کو قرآن نے یسئلو نك اور یستفتو نك کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

مذکورہ بحث کے نتیجہ میں سیرت طیبہ سے ہمیں ایک مفتی سے سوال کرنے کے احکام و آداب کا پتہ چلتا ہے۔ کہ ایک سائل مفتی سے سوال کرنے اور فتویٰ طلب کرنے جائے، تو اس کو کن احکام و آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔ سوالات کے بعد جوابات سے ایک مفتی کے لیے آداب و احکام کا علم ہوتا ہے سطورِ آئندہ میں جواب کے آداب و احکام بیان کیے جائیں گے۔

افتاء سیرت طیبہ کی روشنی میں:

صحابہ کرام کے سوالات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات وفتاویٰ سے فتویٰ کے اصول و ماخذ کا علم ہوتا ہے اوران آداب کا بھی پتہ چلتا ہے جن کا ایک مفتی کو خیال رکھنا چاہیے۔ نبی کریم کی سیرت طیبہ سے افتاء کے جو اصول مستفاد ہیں، انہیں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

ا۔سوال کی نوعیت کو سمجھ کر جواب:

نبی کریمؐ کی سیرتِ طیبہ کی روشنی میں افتاء کے اصولوں میں سب سے پہلے اصول یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ آپؐ سوال کی نوعیت کو سمجھ کر اس کے مطابق جواب ارشاد فرماتے۔ مفتی کے لیے یہ بہت ضروری امر ہے کہ وہ سوال کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھے اور پھر اس نوعیت کے مطابق مخاطب وسائل کو جواب دے۔

۲۔مخاطب کے ذہن کو ملحوظ رکھنا:

سوال کی نوعیت کے ساتھ دوسرا اہم اصول یہ مستفاد ہے کہ نبی کریمؐ مخاطب کے ذہن، اس کے نظریات وافکار اور اس تمام پس منظر کو ملحوظ رکھ کر جواب مرحمت فرماتے جس پس منظر میں سوال کیا گیا ہے اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مفتی کو مخاطب وسائل کے نظریہ، مسلک ومشرب اور اس کے فقہی رجحان ومیلان کو سامنے رکھ کر جواب دینا چاہیے۔

۳۔سوال مختصر، جواب مکمل:

نبی کریمؐ کی سریت طیبہ سے افتاء کے اصولوں میں یہ بات بھی سمجھ میں آرہی ہے کہ سوال و استفتاء اگرچہ مختصر ہوتا تھا لیکن آپ جواب مکمل مرحمت فرماتے۔ اس طرح کا جواب کہ جس کے بعد مزید کسی سوال یا وضاحت کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔

۴۔بے جاسختی سے گریز:

افتاء میں نبی کریمؐ اس بات کو بھی پیش نظر رکھتے کہ جن عبادتوں کی ابھی تک مکمل تفصیلات سامنے نہیں آئیں اور لوگ بہت زیادہ ان سے متعارف نہیں ہوئے، ان میں بہت زیادہ سختی نہ کی جائے چنانچہ بخاری کی روایت کے مطابق حج کے موقع پر نبی کریمؐ نے صحابہ کے بہت سے سوالات پر

''افعل ولا حرج'' کا جواب دیا کہ آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ حج فرض ہوئے ابھی صرف ایک برس کی مدت گزری ہے اور اس حجۃ الوداع سے قبل مسلمانوں نے صرف ایک مرتبہ حج صدیق اکبر کی قیادت میں کیا ہے اس لئے حج کی تعلیمات سے امت ابھی پوری طرح متعارف نہیں، آپ نے ان حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ افعل ولا حرج ارشاد فرمایا امت پر ایسے حالات کسی بھی وقت آسکتے ہیں جبکہ کوئی بھی چیز امت کے لئے نئی اور غیر متعارف ہوسکتی ہے ایسے حالات میں مفتی کو نبی کریمؐ کے اس اسوہ مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے کچھ عرصہ کی گنجائش دینی چاہیے کہ جس دوران امت اس پیش آمدہ مسئلہ سے متعارف بھی ہو جائے اور اس کی عملی دشواریوں سے آگاہ بھی۔

۵۔ اوقات و مقام کا عدم تعین:

نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے افتاء کے لئے کوئی مخصوص وقت یا مقام متعین نہیں کیا ہوا تھا۔ بلکہ جب بھی، جہاں بھی آپ سے مسئلہ پوچھا گیا، سوال کیا گیا اور استفتاء کیا گیا، آپؐ نے مسئلہ کا حل ارشاد فرمایا۔ و اما السائل فلا تنھر (۲۴) کی ہدایت ربانی پر عمل کرتے ہوئے آپؐ نے کبھی کسی مستفتی کو جھڑک کر واپس نہیں کیا بلکہ ہر سائل سے خندہ پیشانی سے سوال کو سنا اور شفقت و محبت اور رحمت و رافت کے ساتھ جواب عطاء فرمایا۔ حتیٰ کہ قریش مکہ کے اپنے سوالات کے جواب میں بھی آپ نے کسی سخت ردعمل کا اظہار نہیں فرمایا جن میں طلب علم یا خواہش ہدایت کے بجائے، استہزاء اور تمسخر کا رنگ غالب تھا۔

ماخذ فتاویٰ:

نبی کریمؐ سے جو استفتاءات کیے گئے ان کے جواب و فتویٰ کے کچھ ماخذ کا بھی علم ہوتا ہے۔

۱۔ وحی الٰہی: نبی کریمؐ معلوم ہونے کے باوجود، پیکر علم کے باوصف، زھد و تقویٰ اور شفقت و حجت کی عملی تصویر ہوتے ہوئے بھی فتاویٰ اور جواب کے لیے وحی الٰہی کو دیکھتے، اگر وحی الٰہی پہلے سے موجود ہوتو اس کی روشنی میں جواب دیتے وگرنہ وحی الٰہی کا انتظار فرماتے۔

۲۔ صحابہ سے مشورہ: بعض مواقع پر آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ بھی لیئے۔

۳۔ از خود اجتہاد: نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض فیصلوں کے لیے آپؐ

نے ازخود بھی اجتہاد فرمایا

نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ سے مستفاد استفتاء افتاء کے یہ اصول ہمارے لیے آج بھی روشنی کے مینار ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج ان سے واقفیت، ان پر عمل اور ان کا لحاظ زیادہ ضروری ہوگیا سائلین کو عموماً اور علماء ومفتیان کرام کو خصوصاً ان آداب واصول کا لحاظ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

حواشی

۱۔ ۴:النساء:۱۲۷

۲۔ راغب، مفردات فی غریب القرآن، بذیل مادہ

۳۔ ایضاً

۴۔ ابن منظور الافریقی، لسان العرب، بیروت، دار اصادر، ۱۹۵۶، ج ۱۵:ص ۱۴۸۔۱۴۷

۵۔ وھبہ الزحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دمشق، دار الفکر، ج ۱:ص ۶۵

۶۔ صدیق حسن خان قنوجی، نواب الجبد العلوم، ج ۲:ص ۳۲۷

۷۔ ۱۸:الکہف:۸۳

۹۔ ۲۰:طٰہٰ:۱۰۵

۱۰۔ ۵:المائدہ:۴

۱۱۔ ۲:البقرۃ:۱۲۹

۱۲۔ ۲:البقرۃ:۲۱۵۔۲۱۹

۱۳۔ ثناء اللہ پانی پتی، قاضی، تفسیر مظہری

۱۴۔ شبیر احمد عثمانی، علامہ، فضل الباری شرح صحیح البخاری، کراچی، ج ۱:

۱۵۔ ۲:البقرۃ:۱۸۹

۱۶۔ ۲:البقرۃ:۲۲۲

۱۷۔ ۴:النساء:۱۲۷

۱۸۔ ایضاً ۱۲۷ تا ۱۳۰

۱۹۔ ۷:الاعراف ۷۸، ۷۹:النازعات:۴۲۔

۲۰۔ ۵:المائدہ:۱۰۱

۲۱۔ ۴۹:الحجرات:۲

۲۲۔ ۲:البقرۃ:۶۸، ۶۹، ۷۰ ۲۳۔ ۹۳:الضحیٰ:۱۰